نظمِ قرآن کے قائلین کے درمیان تفسیری اختلافات

حافظ مبشر حسین لاہوری

تفسیر میں نظمِ قرآن کی اِستدلالی حیثیت

آیتوں اور سورتوں میں نظم و مناسبت کی تلاش چونکہ خالص عقل ورائے کی بنیاد پر ہوتی ہے، اس لیے اس میں اختلاف کا وقوع یقینی ہے۔ایک صاحبِ علم نے ایک موقع پر چند آیتوں یا سورتوں کے مابین جو نظم سمجھا ہے، ضروری نہیں کہ دوسرے بھی اس موقع پر وہی نظم دریافت کریں۔اگرچہ بعض مواقع پر اس کا امکان بھی ہے، مگر زیادہ مواقع پر عدم موافقت کا امکان ہی غالب ہوتا ہے۔ مگر مولانا فراہی کا دعویٰ اس کے برعکس یہ ہے کہ نظم قرآن کی رعایت سے اگر تفسیر کی جائے گی تو تفسیر قرآن میں اختلاف بالکل واقع نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''سب سے پہلی چیز جس نے مجھے اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے مجبور کیا ہے وہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ تاویل کا بیش تر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور سورہ کا عمود یعنی مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا۔ بلکہ سب ایک ہی جھنڈے تلے جمع ہو جاتے اور سب کے منہ سے ایک ہی صدا بلند ہوتی... حالت یہ ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے خیال کے مطابق قرآن کی تاویل کررہا ہے اور کلام کو اس کی صحیح سمت سے ہٹا کر جس وادی میں چاہتا ہے اس کو گھسیٹے پھرتا ہے اور نظم کلام، جو صحیح سمت کو متعین کرنے والی واحد چیز ہے اور جس سے اہل بدعت وضلالت اور اصحابِ تحریف کی کج رویوں کی اصلاح ہوسکتی ہے وہ بیچ سے بالکل غائب ہے۔''[۱۵]

یہی بات مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے بھی اس طرح بیان فرمائی ہے:

''یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خود قرآن کے بارے میں ہماری رائیں متفق نہیں ہیں۔ایک ایک آیت کی تاویل کے بارے میں نہ جانے کتنے اقوال ہیں اور ان اقوال میں سے اکثر ایک دوسرے سے متناقض ہیں، لیکن کوئی چیز ہمارے پاس ایسی نہیں ہے جو یہ فیصلہ کرسکے کہ ان میں سے کون سا قول حق ہے۔کسی کلام کی تاویل میں اختلاف واقع ہو تو اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش چیز اس کا سیاق وسباق اور نظام ہی ہوسکتا ہے، لیکن قرآن کے معاملے میں یہ مصیبت ہے کہ لوگ اس کے اندر کسی نظام کے قائل ہی نہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں جو اختلاف بھی پیدا ہوا اس نے اپنا مستقل علم گاڑ دیا۔ ہماری

فقہ کے بہت سے اختلافات صرف بات کو اس کے سیاق اور نظم میں نہ دیکھنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر سیاق و نظم کو ملحوظ رکھا جائے تو اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔" ۵۲

اس کے برعکس آئندہ سطور میں ہم اس سلسلہ میں چند نمونے پیش کر کے یہ ثابت کریں گے کہ نظم قرآن کے قائلین کے ہاں بھی اختلاف پائے جاتے ہیں اور یہ اختلافات بھی اختلافِ تنوّع نہیں، بلکہ اختلافِ تضاد کی قبیل سے ہیں۔ نظم قرآن کے قائلین کے تفسیری اختلافات سے پہلے سرسری طور پر یہ بات یاد رہے کہ جتنے مفسرین نے بھی نظم و مناسبت پر قلم اٹھایا ہے، ان کا پیش کردہ نظم ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اگر یہ بات ایسی ہی ہے اور فی الواقع ایسی ہے، تو آئندہ بھی جو اصحاب نظمِ قرآن پر قلم اٹھائیں گے ان کے ہاں بھی اختلافات نمایاں ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر فریق اپنے پیش کردہ نظام ہی کو حتمی قرار دے اور اس کے خلاف دیگر تفاسیر کی نفی کے ساتھ ہر اس روایت کی بھی نفی کرے جو اس کے وضع کردہ نظام کے خلاف معلوم ہو۔

۱ -زمخشریؒ کا نظم قرآن:

'نظم قرآن' کے جس پس منظر میں ہم بحث کر رہے ہیں اس پر متقدمین میں سے باقاعدہ طور پر سب سے زیادہ کام امام زمخشریؒ (۴۶۷ھ -۵۳۸ھ) نے کیا ہے۔ ان کے نظم قرآن کے بعض نمونے ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں، اس لیے خوف طوالت سے یہاں ان کے اعادہ اور مزید نمونوں سے گریز کر رہے ہیں۔ بعض اہل علم نے زمخشری کے نظم قرآن کو اپنے مطالعہ کا موضوع بھی بنایا ہے، اس لیے تفصیل کے شائقین اس سلسلہ میں ان کی تحریروں کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ۵۳

زمخشری کی تفسیر اور ان اہل علم کی تحریروں کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمخشری نے اپنے مخصوص انداز میں قرآن مجید کی آیتوں میں نظم و مناسبت کی نشان دہی کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مگر بہت سے مقامات، جہاں نظم و مناسبت کی ظاہراً ضرورت محسوس ہو سکتی تھی، وہاں انہوں نے سکوت اختیار کیا ہے۔ آیات کے باہمی نظم و مناسبت پر گفتگو کے باوجود علامہ زمخشری نے قرآن مجید کو ایک مربوط کتاب کی شکل میں اپنے نظم قرآن کا موضوع نہیں بنایا۔ اس لیے ان کا پیش کردہ نظم قرآن مولانا فراہی، مولانا اصلاحی اور بعض دیگر اصحاب علم کے پیش کردہ نظم قران کے مطابق نہیں ہے۔

۲ -رازیؒ کا نظم قرآن

زمخشریؒ کے بعد امام ارازیؒ (۶۰۶-۵۴۴ھ) وہ مفسر ہیں جنہوں نے نظم قرآن پر اپنی تفسیر میں جابجا گفتگو کی ہے۔ مگر ان کا انداز بھی فراہی، اصلاحی، زمخشری وغیرہ سے مختلف ہے۔ انہوں نے نظم قرآن کی ابتدا سورہ بقرہ کی پانچویں آیت سے کی ہے اور اس آیت کا ماقبل سے وہ نظم و ربط پیش کیا ہے جو خود ان کی سمجھ میں آیا۔ پھر اس کے بعد بے شمار آیات کی لمبی چوڑی تفسیریں کرتے

ہوئے وہ اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے ان میں نظم و مناسبت ظاہر کرنے کی مطلق ضرورت ہی نہیں۔ پھر درمیان میں کہیں کہیں نظم قرآن کے موضوع پر حسب ضرورت جزوی طور پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں اور جیسے جیسے اس سورت کا اختتام قریب آتا ہے ویسے ویسے وہ اس کی آیتوں کے نظم و مناسبت کی طرف توجہ دینا شروع کر دیتے ہیں اور جہاں بھی وہ نظم کی بات کرتے ہیں وہاں ایک ہی آیت کا ایک نظم بیان کرنے کے بجائے بے شمار نظم بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی ایک آیت ہے:

{يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ...وَاتَّقُوا اللهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللهُ وَاللهُ بِكُلِّ شَيْئٍ عَلِيْمٌ}(آیت نمبر ۲۸۲)

اس کے تحت اس کے نظم پر گفتگو کرتے ہوئے امام رازیؒ فرماتے ہیں:

''اس آیت میں چند مسائل ہیں۔ پہلا مسئلہ اس کے نظم و مناسبت کے بارے میں ہے جو دو طرح سے ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس حکم سے پہلے دو طرح کے احکام دیئے تھے، ایک انفاق فی سبیل اللہ کا جو لازمی طور پر مال میں کمی کا موجب ہے اور دوسرا سود چھوڑ دینے کا اور یہ بھی نقص مال کا سبب ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حکموں کے آخر میں ایک بہت بڑی وعید سنائی اور کہا: 'ڈر جاؤ اس دن سے جب تم اللہ کے حضور لوٹائے جاؤ گے۔' یہ ڈر اور تقویٰ ایسی چیز ہے جو انسان پر مال کمانے اور منافع وصول کرنے کے بہت سے (ناجائز) راستے بند کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد حلال مال کی حفاظت کرنے اور اسے ضیاع اور تباہی سے بچانے کے لیے حکم دیا، کیونکہ انفاق فی سبیل اللہ، ترکِ سود اور مداومت تقویٰ کا عمل اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ (موجود حلال) مال کی حفاظت نہ کی جائے۔ لہٰذا اسی نکتے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حلال مال کی حفاظت کرنے اور اسے ہلاکت و تباہی سے بچانے کے لیے حکمِ وصیت میں مبالغہ سے کام لیا۔''

نظم کلام کی یہ توجیہ بیان کرنے کے بعد امام رازیؒ فرماتے ہیں:

فهذا هو الوجه الاول من وجوه النظم وهوحسن لطيف ۵۴؎

نظم کلام کی مختلف توجیہات میں سے یہ پہلی توجیہ تھی، اور یہی اچھی اور لطیف توجیہ ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ نظم کی جس توجیہ کو امام رازی اچھی اور عمدہ قرار دے رہے ہیں، نظم قرآن کے دیگر قائلین کے ہاں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

آگے امام رازیؒ نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۴ کے تحت اس آیت کا ما قبل کے ساتھ چار مختلف طرح کا نظم بیان کیا ہے۔ پہلا نظم امام اصم کے حوالے سے ہے، دوسرا ابو مسلم اصفہانی، تیسرا قاضی اور چوتھا شعبی، عکرمہ اور مجاہد کی روایات کے حوالے سے۔ ۵۵؎

اسی طرح آگے آیت ۲۸۵ کا ایک ہی جست میں پچھلی تمام سورت کے ساتھ نظم بیان کرتے ہوئے مختلف نکات و لطائف ضبط تحریر میں لاتے ہیں اور پھر اس کا بھی صرف ایک نظم نہیں، بلکہ چار طرح کا مختلف نظم بیان کرتے ہیں۔ ۵۶

پھر وہ اس آیت کے مختلف جملوں کا گذشتہ سورت کے ساتھ مختلف پہلوؤں سے الگ الگ نظم ثابت کرتے ہوئے مختلف نکات بیان کرتے ہیں۔

اسی طرح سورۂ آل عمران کے آغاز ہی میں 'تیسرے مسئلہ' کے تحت فرماتے ہیں:

''اس سورت کا آغاز ایک لطیف اور عجیب نظم کا حامل ہے۔'' ۵۷

وہ نظم کیا ہے؟ اس سلسلہ میں انھوں نے سورۂ آل عمران کا ماقبل سورت یا مابعد سورت کے ساتھ کوئی نظم ثابت نہیں کیا، بلکہ اس کا تعلق خارجی طور پر عیسائیوں کے ان اعتراضات سے جوڑا ہے جو وہ اللہ کے رسول ﷺ سے معرفتِ الٰہ' اور حقیقتِ نبوت کے حوالے سے اٹھایا کرتے تھے۔ وہ اعتراضات سورۂ بقرہ یا آل عمران سے نہیں، بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں سورۂ آل عمران میں ان اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ اس طرح امام رازیؒ نے اس سورہ کا تعلق قرآن سے خارج ایک چیز کے ساتھ قائم کر دکھایا ہے۔ ۵۸

یہی صورت حال امام رازی نے اس سورت کی چودھویں آیت میں بھی پیدا کی ہے اور اس کے دو طرح کے نظم دریافت کیے ہیں۔ ایک کا تعلق پچھلی آیت (نمبر ۱۳) سے اور دوسرے کا تعلق اس کی شان نزول سے متعلقہ روایات سے قائم کیا ہے۔ ۵۹

اس مختصر سی بحث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نظم قرآن کے سلسلہ میں امام رازیؒ کا اپنا ایک منفرد اسلوب تھا، جو نہ متقدمین میں سے علامہ زمخشریؒ سے ملتا ہے اور نہ متاخرین میں سے مولانا فراہیؒ سے۔

۳ - امام بقاعیؒ کا نظم قرآن

امام بقاعیؒ کا بھی نظم قرآن کے سلسلہ میں اپنا ایک مخصوص طرز فکر ہے۔ انہوں نے نظم قرآن کی رعایت کرتے ہوئے 'نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور' نامی تفسیر لکھی ہے۔ انہوں نے اس تفسیر کے مقدمہ ہی میں یہ واضح کر دیا ہے کہ:

''میں اس تفسیر میں آیتوں اور سورتوں کے باہمی نظم و مناسبت پر گفتگو کروں گا اور میں نے (اس کے لیے) قرآن مجید کی آیات میں خوب غور و فکر سے کام لیا ہے۔'' ۶۰

نیز فرماتے ہیں:

''یہ عظیم الشان کتاب ایسے موضوع پر ہے جس پر مجھ سے پہلے کسی نے (اس طرح) قلم نہیں اٹھایا اور نہ میری طرح کسی نے اس بارے میں فکری جولانیاں دکھائی ہیں۔''۶۱

گویا امام بقاعی کا نظم بھی ان کا اپنا وضع کردہ ہے۔ البتہ انہوں نے اپنی تفسیر میں مفسر ابوالحسن علی بن احمد حسن الحرالی (م ۶۳۷ھ) کی تفسیر ''مفتاح الباب المقفل علی فهم القرآن المنزل'' سے خوب استفادہ کیا ہے۔ ۶۲ حالاں کہ اس مفسر نے صوفیہ کے اشاراتی اسلوب پر اپنی یہ تفسیر مرتب کی ہے اور اس میں جابجا صوفیانہ کشفی مباحث سے تعرض کیا گیا ہے، بالخصوص حروف مقطعات کی تفسیر میں صوفیانہ انداز سے جن اسرار و رموز پر 'حرالی' نے قلم اٹھایا تھا، اس کا بڑا حصہ امام بقاعی نے بھی بغیر کسی نقد کے اپنی تفسیر میں سمو لیا ہے۔ تفسیر کے آغاز میں سورۂ فاتحہ کے تحت امام بقاعی نے ابوالفضل احمد بن محمد المغربی البجائی المالکی (م ۸۶۵ھ) کے حوالے سے نظم قرآن کی تلاش کا وہ قاعدہ بھی بیان کیا ہے جسے ہم شروع میں امام سیوطی کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں۔ امام بقاعی فرماتے ہیں:

''اس قاعدہ کو مد نظر رکھ کر قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے مجھے دس سال گزر گئے اور میں ابھی سورۂ سبا تک پہنچا تھا کہ مجھے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ہر سورت کا جو نام ہے وہ اس سورت کے موضوع و مقصود سے تعلق رکھتا ہے، کیونکہ ہر چیز کا نام اس چیز کے ساتھ ایک مناسبت رکھتا ہے اور اس چیز کی تفصیلات پر اجمالاً اشارہ کرتا ہے۔ حضرت آدمؑ کے سامنے فرشتوں کی موجودگی میں جب مختلف اشیاء پیش کر کے ان کے نام کے بارے میں سوال کیا گیا تھا تو انہوں نے بھی وہاں اسی (قاعدہ) کے پیش نظر جواب دیا تھا۔ ہر سورت کا موضوع اس کے باہمی نظم و مناسبت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لہذا میں ہر سورت کا موضوع ذکر کروں گا اور اس میں اور سورت کے نام میں مناسبت ظاہر کروں گا اور ہر سورت کی بسم اللہ (بَسْمَلَة) کی میں وہی تفسیر کروں گا جو اس کے موضوع کے مناسب ہو گی۔''۶۳

چنانچہ امام بقاعی ہر سورت کے شروع میں اس کا موضوع متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر اس کے مطابق سورت کی تفسیر کرتے ہوئے آیات کے نظم و مناسبت پر خالص صوفیانہ انداز میں روشنی ڈالتے ہیں اور ابوالحسن حرالی کے حوالے سے ایسے ایسے صوفیانہ مباحث چھیڑتے ہیں کہ مجھ جیسا ہر طالب علم دنگ رہ جاتا ہے۔ مثلاً سورۂ فاتحہ کے موضوع کے حوالے سے فرماتے ہیں:

و هو المراقبة التي ساقول انها مقصودها۶۴

اس کا موضوع 'مراقبہ' ہے جیسا کہ میں آگے ذکر کروں گا۔

پھر انہوں نے اس سورت کی آیات کی تفسیر صوفیہ کی اشاراتی زبان میں کی ہے۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کے آغاز میں فرماتے ہیں:

''اس سورہ کا موضوع اس کتاب (قرآن) کو کتاب ہدایت ثابت کرنا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں کہا ہے اس کی پیروی کی جائے۔ اور سب سے بڑی چیز جس سے ہدایت لی جاسکتی ہے وہ ایمان بالغیب ہے جس کا مرکز ایمان بالآخرۃ اور ملخص مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لانا ہے۔ اسی لیے اس سورت کا نام گائے کے زندہ کرنے کے واقعہ کی مناسبت سے 'بقرہ' رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس سورت میں حضرت ابراہیمؑ کے مردہ پرندے زندہ کیے جانے اور بنی اسرائیل کے (کچھ افراد کے) مرنے کے بعد زندہ کیے جانے کے واقعات بھی مذکور ہیں، مگر اپنے موضوع پر جو دلالت بقرہ کے واقعہ سے ہوتی ہے وہ کسی اور واقعہ سے نہیں ہوتی۔''
۶۵

امام بقاعی نے اس سورت میں بسم اللہ اور الم (حروف مقطعات) کی ایک نئے صوفیانہ انداز سے تفسیر کی ہے، پھر آگے چل کر سورۂ فاتحہ کی سورۂ بقرہ کے ساتھ یہ مناسبت بیان کی ہے کہ فاتحہ میں ہدایت کی دعا تھی اور یہاں اس کے جواب کے طور پر بتایا گیا ہے کہ وہ ہدایت اس کتاب الٰہی میں موجود ہے۔ ۶۶

سورۂ بقرہ کا ربط سورۂ آل عمران سے ثابت کرنے کے لیے امام بقاعی سورۂ بقرہ کی اختتامی بحث آیۃ الکرسی پر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آیت الکرسی ہی حقیقت میں سورۂ بقرہ کی آخری آیت ہے، جب کہ اس کے بعد سورۂ بقرہ کی جو آیات مذکور ہیں وہ سب آیت الکرسی کی تفصیلات بیان کرتی ہیں۔ آیت الکرسی میں توحید باری تعالیٰ کا بیان تھا، اس لیے سورۂ آل عمران کا موضوع ہی توحید کا اثبات ہے۔ اسی نکتہ توحید پر امام بقاعی دونوں سورتوں کا ربط ثابت کرتے ہیں۔ ۶۷

امام بقاعی نے سورۂ بقرہ کی آیات ۱۷ تا ۲۰ میں بیان ہونے والی دو مثالوں کا مصداق منافقین کو قرار دیا ہے۔ ۶۸ جب کہ مولانا اصلاحی صاحب کے پیش کردہ نظمِ قرآن کے مطابق پہلی مثال کفار کے اور دوسری منافقین کے بارے میں ہے۔

اس مختصر سی بحث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام بقاعی نے اپنی تفسیر میں جو نظم قرآن پیش کیا ہے وہ متقدمین و متاخرین میں سب سے الگ ہے۔

۴ - مولانا فراہی و مولانا اصلاحی کا نظم قرآن

مولانا فراہی برصغیر کی ایک عبقری شخصیت ثابت ہوئے۔ آپ نے علومِ قرآن کو اپنا خاص موضوع بنایا اور اس سلسلہ میں نظمِ قرآن کو وسعت دیتے ہوئے پورے قرآن مجید کو ایک مربوط و منظم کتاب ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ آپ نے اپنی عقل و بصیرت اور متقدمین کے مباحث سے استفادہ کرتے ہوئے قرآن مجید کا ایک نیا نظام دریافت کیا اور اس کے مطابق قرآن مجید کی

تفسیر کی طرح ڈالی۔ آپ اپنی تفسیر مکمل نہ کر سکے، مگر آپ کے وضع کردہ اصولوں کو منقح کر کے آپ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے 'تدبر قرآن' کے نام سے قرآن مجید کی ایک مکمل تفسیر لکھی جس کے کئی ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں اور ادبی حلقوں میں یہ تفسیر اپنا ایک خاص مقام منوا چکی ہے۔ مولانا فراہی و مولانا اصلاحی نے اپنے سے پہلے کی نظم قرآن کی تمام کوششوں کو ناکافی بلکہ غیر معتبر قرار دیا۔ مثلاً مولانا فراہی نظم قرآن کے حوالے سے امام رازی پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دوسرا سبب (جو گو پہلے کی نسبت کم اہم نہیں ہے، لیکن اس کا تعلق مصنفین کے بجائے ان مصنفین کے عام قارئین سے ہے) یہ ہے کہ جن لوگوں نے نظم کی طرف توجہ کی (مثلاً امام رازیؒ) انہوں نے اس مشکل کام میں ایسی چیزوں پر قناعت کر لی جو تار عنکبوت سے بھی زیادہ کم زور تھیں۔ اگرچہ امام رازیؒ نظری علوم اور فہم و ذکاوت میں بہت آگے ہیں، لیکن ان کے کلام پر غور کرنے والے ہر شخص کو یقین ہو جاتا ہے کہ جس نظم کا یہ متبحر امام اور ان جیسے دوسرے لوگ دعویٰ کرتے ہیں اگر اس کا کوئی وجود ہوتا تو ان جیسے غور و فکر کرنے والے لوگوں سے مخفی نہ رہا ہوتا۔ جب وہ نظم کی نہایت کم زور توجیہات کر دیتے ہیں تو پڑھنے والے کے اندر اس علم کا شوق ہی باقی نہیں رہتا۔''۶۹؎

اسی طرح مولانا اصلاحی فرماتے ہیں:

''جن لوگوں نے قرآن میں نظم کا دعویٰ کیا، ان کی خدمات کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز پیش نہیں کر سکے جو اس راہ میں قسمت آزمائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتی۔ اوپر جن بزرگ مصنفوں کے اقوال وارشادات نقل ہوئے ہیں ان میں سے تین بزرگوں کی کتابوں سے استفادے کا موقع مجھے نصیب ہوا ہے۔ میں بلا کسی ارادۂ تحقیر کے عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی کی کتاب سے بھی مجھے کسی مشکل کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ مہائمیؒ اور رازیؒ کی تفسیریں عرصے تک میرے مطالعے میں رہی ہیں، بلکہ رازی کی تفسیر تو اب بھی پیش نظر رہتی ہے۔ یہ حضرات جس قسم کا نظم بیان کرتے ہیں اس کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو گا کہ اس قسم کا نظم ہر دو غیر متعلق چیزوں میں جوڑا جا سکتا ہے۔ اصل ضرورت اس چیز کی تھی کہ لوگوں کے سامنے کوئی ایسی چیز آتی جو قرآن کے نظم کو اس طرح واضح کر دیتی کہ ہر صاف ذہن قاری کو وہ اپنے دل کی آواز معلوم ہونے لگتی، لیکن اس طرح کی کوئی چیز نہ صرف یہ کہ لوگوں کے سامنے آئی نہیں، بلکہ جو چیزیں آئیں وہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مایوس کن ثابت ہوئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے نظم کی تلاش کو، 'کوہ کندن کاہ بر آوردن' کا مصداق سمجھ لیا۔ اس راہ میں سب سے پہلی کامیاب کوشش کی سعادت میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کو حاصل ہوئی۔''۷۰؎

مولانا فراہی و مولانا اصلاحی کے تفسیری اختلافات

مولانا فراہی نے نظمِ قرآن کا جو فلسفہ پیش کیا ہے مولانا اصلاحی اس سے نہ صرف پوری طرح متفق تھے، بلکہ انھوں نے اپنے استاد کے نامکمل کام کی تکمیل کرتے ہوئے پورے قرآن کی از خود تفسیر لکھی اور اپنے استاد کے پیش کردہ اصولوں اور فلسفۂ نظمِ قرآن کا پورا خیال رکھا، مگر اس کے باوجود اصلاحی و فراہی کے ہاں بھی تفسیری اختلافات ملتے ہیں۔ مولانا فراہی نے اپنے فلسفۂ نظم کی روشنی میں صرف چند سورتوں کی تفسیر کی، جو قرآن مجید کی مجموعی تفسیر کے مقابلہ میں بمشکل دس فیصد ہو گی، مگر اس دس فیصد میں بھی جب اصلاحی و فراہی کے ہاں اختلافات پائے جاتے ہیں تو پھر مولانا فراہی کی مکمل تفسیر کی موجودگی میں یہ اختلافات کہیں بڑھ جاتے اور فراہی و اصلاحی کی یہ بات اور بھی کم زور ہو جاتی کہ 'نظم قرآن کی رعایت سے تمام تفسیری اختلاف ختم ہو سکتے ہیں'۔ سطورِ ذیل میں مولانا فراہی و مولانا اصلاحی کے تفسیری اختلافات کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

پہلا نمونہ: گروپ بندی میں اختلاف

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ مولانا فراہی و مولانا اصلاحی کے ہاں سورہ فاتحہ قرآن مجید کا دیباچہ، معوذتین اس کا خاتمہ، درمیانی سورتیں چند مجموعوں کی شکل میں اس کے باب (گروپ) اور ہر مجموعہ کی ہر سورت فصل کی طرح اپنے باب سے متصل ہے۔ مولانا فراہی و مولانا اصلاحی کے ہاں سورتوں کی اسی گروپ بندی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولانا فراہی کے ہاں سورتوں کے گروپ نو (۹) جب کہ مولانا اصلاحی کے ہاں سات ہیں۔ [۱]

پھر ان گروپوں میں موجود سورتوں کی تقسیم میں بھی دونوں حضرات کے ہاں اختلاف ہے۔ مولانا فراہی کے ہاں پہلے گروپ میں فاتحہ سے مائدہ تک، دوسرے میں الانعام سے الاعراف تک اور تیسرے میں یونس سے الحج تک سورتیں شامل ہیں۔ [۲] جب کہ مولانا اصلاحی کے ہاں تیسرے گروپ میں یونس سے نور تک سورتیں شامل ہیں، الحج تک نہیں۔ پھر اگلے چوتھے گروپ میں فرقان سے احزاب تک سورتیں شامل ہیں، مگر فراہی کے ہاں چوتھا گروپ المومنون سے النور تک ہے۔ آگے پانچواں گروپ مولانا اصلاحی کے ہاں سورۂ سبا سے سورۂ حجرات تک ہے، مگر مولانا فراہی کے ہاں یہ الفرقان سے الاحزاب تک ہے۔ پھر مولانا اصلاحی کے ہاں چھٹا گروپ سورۂ ق سے سورۂ تحریم تک ہے، مگر فراہی کے ہاں چھٹا گروپ سورۂ سبا سے سورۂ حجرات تک ہے۔ مولانا اصلاحی کے ہاں ساتواں گروپ سورۂ ملک سے سورۂ ناس تک ہے، جب کہ مولانا فراہی کے ہاں ساتواں گروپ سورۂ ق سے سورۂ تحریم تک، آٹھواں گروپ سورہ ملک سے سورۂ اخلاص تک اور نواں گروپ معوذتین پر مشتمل ہے۔ [۳]

سب سے پہلی بات تو یہی قابل غور ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی یہ گروپ بندی قرآن وسنت یا اجماعِ امت، یا اقوالِ صحابہ و تابعین میں سے آخر کس دلیل پر مبنی ہے ؟اس گروپ بندی کی بنیاد مولانا فراہی و مولانا اصلاحی کا ذاتی غور و فکر ہے اور پھر اس غور و فکر میں شروع ہی میں یہ دونوں حضرات اختلافِ رائے کا شکار ہو گئے ہیں۔ جب اس فلسفۂ نظمِ قرآن کے بانیوں کا یہ حال ہے تو پھر ان کے پیش کردہ نظمِ قرآن کے فلسفہ کو آخر اصول تفسیر میں بنیادی و کلیدی حیثیت کیسے دی جاسکتی ہے ؟!

دوسرا نمونہ: تفسیر قرآن میں بسم اللہ کی حیثیت کے تعین میں اختلاف

کیا 'بسم اللہ' ہر سورت کی ایک آیت ہے یا محض تبرک کے لیے ایک اضافہ ؟اس میں مفسرین کے ہاں پہلے بھی اختلاف رائے موجود تھا اور فراہی و اصلاحی کے ہاں بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے۔ مولانا فراہی کے بقول:

''ہمارے نزدیک بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت اور ہر سورت کی فاتحہ ہے۔''۴؎

جب کہ مولانا اصلاحی کی رائے اپنے استاد سے بالکل مختلف ہے۔ فرماتے ہیں:

''(مدینہ) بصرہ اور شام کے قراء اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ بسم اللہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی سورت کی بھی (بشمول سورۂ فاتحہ) آیت نہیں ہے، بلکہ ہر سورت کے شروع میں اس کو محض تبرک اور ایک علامتِ فصل کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اس سے ایک سورت دوسری سورت سے ممتاز بھی ہوتی ہے اور قاری جب اس سے کسی سورت کا افتتاح کرتا ہے تو اس سے برکت بھی حاصل کرتا ہے۔ یہی مذہب امام ابو حنیفہؒ کا ہے۔ اس کے برعکس مکہ اور کوفہ کے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کی بھی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں کی بھی ایک آیت ہے۔ یہ مذہب امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کا ہے۔''۵؎

پھر آگے اپنے استاد سے اختلافِ رائے ظاہر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ اس کو سورۂ فاتحہ کی ایک آیت اور دوسری سورتوں کے لیے بمنزلۂ فاتحہ مانتے ہیں۔ مجھے قوی مذہب قرائے مدینہ کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب تمام تر وحی الٰہی کی رہنمائی اور رسول ﷺ کی ہدایت کے تحت عمل میں آئی اور بسم اللہ کی کتابت بھی اسی ترتیب کا ایک حصہ ہے۔ اس ترتیب میں جہاں تک بسم اللہ کے لکھے جانے کی نوعیت کا تعلق ہے سورۂ فاتحہ اور غیر سورۂ فاتحہ میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر سورہ کے آغاز میں اس کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے۔ اس کی حیثیت سورہ سے الگ ایک مستقل آیت کی نظر آتی ہے۔''۶؎

تیسرا نمونہ: واستعینوا بالصبر والصلٰوۃ میں 'صبر' کی تفسیر میں اختلاف

سورۂ بقرہ کی آیت وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ [آیت نمبر ۴۵] میں صبر کی تفسیر میں بھی مولانا فراہی و اصلاحی کے مابین اختلاف ہے۔ چنانچہ تفسیر تدبر قرآن میں مولانا اصلاحی رقم طراز ہیں:

''استاذ امام کا خیال تو یہ ہے کہ وَاسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوة میں اصل مقصود نماز پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانے کی تاکید ہے۔ اس کے ساتھ صبر کا جو ذکر آیا ہے وہ محض اس لیے ہے کہ اس کی حیثیت نماز کے لیے شرط اور ذریعہ کی ہے۔ کیونکہ نماز پر استقلال کے ساتھ جمے رہنا صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ نماز کی مثال مولانا کے نزدیک ایک عظیم پل کی ہے جس کی تعمیر صرف ایک محکم بنیاد پر ہی ممکن ہے۔ مولانا کا استدلال ''وَامُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا'' طٰہٰ: ۱۳۲ (اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور جم جاؤ) اور اس مضمون کی بعض دوسری آیات سے ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر ذرا اس سے مختلف ہے۔''۷؎

مولانا اصلاحی کا اس سلسلہ میں کیا نقطۂ نظر ہے، اس کو انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مولانا فراہی کے برعکس مولانا اصلاحی صبر کو نماز ہی کی طرح ایک الگ اور مستقل چیز قرار دیتے ہیں۔ اسے نماز کی شرط یا ذریعہ یا تابع تسلیم نہیں کرتے۔

چوتھا نمونہ

اسی آیت کے اگلے ٹکڑے میں بھی مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کے درمیان اختلاف ہے، جیسا کہ مولانا اصلاحی رقم طراز ہیں:

''وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ: اس ٹکڑے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وانھا میں ھا کا مرجع کیا ہے؟ مجاہد کے نزدیک اس کا مرجع صلوة ہے۔ اسی قول کو امام ابن جریرؒ نے ترجیح دی ہے۔... دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مرجع وہ ہدایت و نصیحت ہے جو پچھلے جملہ میں مذکور ہوئی ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ پہلے قول کے حق میں ہیں۔ اس کی تائید میں انہوں نے چند دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔... لیکن میرا اپنا رجحان دوسرے قول کی طرف ہے۔''۸؎

پانچواں نمونہ: 'حکمت' کی تفسیر میں اختلاف

سورۂ بقرہ کی آیت: ۱۲۹ میں ہے: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جو انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے) اس آیت میں مذکور حکمت سے کیا مراد ہے؟ اس میں بھی مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی میں اختلاف ہے۔ مولانا فراہی کی رائے یہ ہے کہ حکمت سے مراد احکام و دانش کی باتیں ہیں، حدیث نہیں اور جو لوگ اس کی تفسیر حدیث سے کرتے ہیں ان کی رائے کمزور (مرجوح) ہے۔۹؎

جب کہ مولانا اصلاحی سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت کے تحت اس رائے کو وزنی قرار دیتے ہیں جسے ان کے استاد مولانا فراہی نے کم زور اور مرجوح قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیمِ حکمت تعلیمِ کتاب سے ایک زائد شے ہے، اگرچہ یہ حکمت سر تا سر قرآن حکیم ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔''۸۰؎

چھٹا نمونہ: لفظ یطیقون کی تفسیر میں اختلاف

سورۂ بقرہ کی آیت: ۱۸۴ یہ ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ اس کی تفسیر میں بھی فراہی و اصلاحی کے درمیان اختلاف ہے۔ مولانا فراہی اس کی تفسیر میں اپنا نقطۂ نظر اس طرح بیان کرتے ہیں:

وعلى الذين يطيقون الصوم اواطعام مسكين على اختلاف القول۔ واماقول البعض بان المراد من يطيقون لايطيقون فلا ارى له وجهاصحيحا۔ ۸۱؎

اور جو لوگ روزہ رکھ سکتے ہیں یا مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں، یہ دو قول ہیں اور ان دونوں کی گنجائش ہے۔ البتہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ 'یطیقون' کا مطلب لایطیقون ہے تو اس رائے کے حق میں مجھے کوئی موزوں بات نظر نہیں آتی۔

جس سیاق و سباق میں مولانا فراہی نے یہ بات کہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک رمضان کے روزوں کی فرضیت کے سلسلہ میں ابتدا میں اس بات کی گنجائش تھی کہ روزہ رکھنے کی طاقت کے باوجود بھی اگر کوئی آدمی روزہ نہ رکھنا چاہے تو وہ اس کے بدلہ میں کسی مسکین کو کھانا کھلا دے، مگر مولانا اصلاحی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر میں اپنے استاد کے برعکس یہ رائے دیتے ہیں:

''اس تاویل کو قبول کر لینے کے بعد مسئلہ کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ پہلے جو روزے فرض ہوئے تھے اس میں اس بات کی بھی گنجائش تھی کہ اگر لوگ روزے نہ رکھنا چاہیں تو اس کا بدل مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر دیں۔ بلکہ قرآن کے الفاظ سے اس کی اصلی شکل یہ سامنے آتی ہے کہ جو لوگ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہیں کر سکتے تھے ان کو اس بات کی اجازت ہے کہ دوسرے دنوں میں یا تو روزہ رکھ کر ان چھوڑے ہوئے روزوں کی تلافی کر دیں یا ایک روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا بدل پورا کر دیں۔ گویا اس وقت تک قضا روزوں کی تلافی مسکین کو کھانا کھلا کر بھی ہو سکتی تھی۔ بعد میں

یہ اجازت، جیسا کہ آگے والی آیت سے واضح ہو گا، منسوخ ہو گئی، یعنی قضا شدہ روزوں کی جگہ بھی روزے رکھنا ہی ضروری قرار دیا گیا۔"۸۲؎

ساتواں نمونہ: نبی اور رسول میں فرق کا مسئلہ

یہ مسئلہ اہل علم کے ہاں پہلے بھی مختلف فیہ رہا ہے اور فراہی و اصلاحی کے ہاں بھی اس میں دو الگ اور متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ مولانا فراہی نے سورہ نساء کی آیات ۱۶۴، ۱۶۳ کے تحت پہلے تو اس عام خیال کی تردید کی کہ 'رسول صاحب شریعت اور نبی غیر صاحبِ شریعت ہوتا ہے۔۸۳؎ پھر رسول اور نبی کے فرق کے تناظر میں اپنی یہ رائے پیش کی:

"میرا گمان یہ ہے کہ رسول وہ ہے جو کسی قوم کے پاس بھیجا جائے، خواہ وہ (رسول) نبی بھی ہو یا نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے فرستادے جن کا تذکرہ سورۂ یٰس میں ہے۔ رسولوں کے مختلف درجات ہیں۔ ان میں سے کچھ انبیاء اور صاحبِ شریعت ہوتے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: 'یہ رسول ہیں جن کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے، ان میں سے کوئی وہ ہے جس نے اللہ سے رو برو گفتگو کی ہے اور کوئی وہ ہیں جس کو دیگر پہلوؤں سے اللہ نے بلند تر درجہ دیا ہے۔' (بقرہ: ۲۵۳)

"رسولوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ" کو رکھا ہے اور انہی میں حضرت داؤدؑ کو رکھا ہے، جیسا کہ اوپر داؤد اور طالوت کے ذکر کے بعد فرمایا ہے و تلک الرسل اور اس سے چند آیات قبل حضرت سموئیل کو صرف نبی کہا ہے۔ (بقرہ: ۲۴۵) اسی طرح ہم تورات میں دیکھتے ہیں کہ حضرت داؤد کو رسول کہا گیا ہے، نبی نہیں کہا گیا، بلکہ ان کے نبی دوسرے تھے جو ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام بتاتے تھے اور وہ ان سے مشورہ کرتے تھے اور ان کی کہی مانتے تھے۔ مزید براں ہم قرآن اور اسی طرح تورات میں پاتے ہیں کہ وحی رسول یا نبی ہی کے ساتھ خاص نہیں، ہے اس لیے کہ حضرت موسیٰ کی ماں اور حضرت ہاجرہ کو بھی وحی کی گئی ہے۔ اب جب تم کو یہ بات معلوم ہو گئی تو اس سے بات صاف ہو گئی کہ نبی خدائی منصب کا علم بردار ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت نوحؑ اور دوسرے بہت سے رسولوں کا معاملہ ہے اور اسی صف میں سموئیلؑ نبی اور حاد بن داؤد آتے ہیں۔ رسول بسا اوقات نبی بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات نبی نہیں بھی ہوتا۔"۸۴؎

اس اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فراہی کے نزدیک نبی رسول سے افضل ہوتا ہے، اس لیے کہ نبی ہر حال میں صاحبِ وحی ہوتا ہے، جب کہ رسول صاحبِ وحی ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ مولانا اصلاحی اس مسئلہ میں اپنے استاد کے بالکل برعکس اپنی تفسیر میں رسول کو نبی سے برتر ثابت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''رسول اور نبی میں فرق ہوتا ہے۔رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے اس کے لیے خدا کی عدالت بن کر آتا ہے۔اس کے بعد لازماً اس قوم کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔اگر وہ ایمان لاتی ہے تو نجات پاتی ہے اور اگر اپنے کفر پر اڑی رہتی ہے اور اپنے نبی کو گزند پہنچانے کی کوشش کرتی ہے تو فنا ہو جاتی ہے۔اس حقیقت کی طرف حضرت یحییٰ نے مختلف اسلوبوں سے اشارہ فرمایا تھا، مثلاً یہ کہ میں تو تمہیں پانی سے بپتسمہ دے رہا ہوں، پر جو آرہا ہے وہ تمہیں آگ سے بپتسمہ دے گا۔''۸۵

آگے فرماتے ہیں:

''انبیاء میں سے جو رسول کے درجے پر فائز ہوتے ہیں وہ اپنی قوم کے لیے عدالت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے ذریعہ سے لازماً قوم کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔رسول اور اس کے ساتھیوں کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے مخالفین شکست کھاتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ غلبہ رسول کی موجودگی میں حاصل ہو یا اس کے رخصت ہو چکنے کے بعد''۸۶

آٹھواں نمونہ: سورۂ آل عمران کی آخری آیت کی تفسیر میں اختلاف

سورۂ آل عمران کی آخری آیت میں وَرَابِطُوْا کا لفظ آیا ہے۔اس سے کیا مراد ہے؟اس کی تفسیر میں بھی مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی میں اختلاف ہے۔مولانا فراہی فرماتے ہیں:

''وَرَابِطُوْا' یعنی کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کرو، ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کر کے ان کے درمیان پائے جانے والے جھگڑوں کو ختم کر کے۔اسی طرح آپس میں حسن سلوک کا راستہ اپنا کر۔''۸۷

اس کے برعکس مولانا اصلاحی رقم طراز ہیں:

''تیسری چیز مرابطہ ہے۔مرابطہ ربط الخیل سے ہے۔اس کا اصل ابتدائی مفہوم دشمن کے مقابلے اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جنگی گھوڑے تیار رکھنا ہے۔اب گھوڑوں کی جگہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں نے لے لی ہے۔اس وجہ سے حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اس لفظ کا مفہوم بھی تبدیل ہو جائے گا۔مصابرت کی ہدایت کے بعد یہ مرابطت کی ہدایت دشمن کے مقابلے کے لیے اخلاقی تیاری کے ساتھ مادی تیاری کی ہدایت ہے۔''۸۸

یعنی مولانا فراہی کے ہاں مرابطہ کے مفہوم میں عموم ہے، جب کہ مولانا اصلاحی اسے جنگ و جہاد کے ساتھ خاص کر رہے ہیں۔

ہم نے سورۂ آل عمران تک نہایت سرسری جائزہ لے کر چند ایسے نمونے پیش کیے ہیں، جن میں فراہی و اصلاحی کے مابین تفسیری اختلافات بالکل نمایاں ہیں۔اگر دونوں بزرگوں کی تمام تفسیری آراء کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ایسے بیسیوں اختلافات سامنے

آئیں گے۔ نظمِ قرآن کا فلسفہ اگر اتنا اہم، کلیدی اور اصولی تھا کہ بقول مولانا فراہی و مولانا اصلاحی اس سے تفسیری اختلافات بھی مٹ جاتے ہیں، تو کم از کم اس فلسفہ کے زبردست حامیوں کے ہاں تو یہ اختلافات نہیں ہونے چاہیے تھے۔ مگر آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ نظم قرآن کے قائل ہر صاحبِ تفسیر کا نظم دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ حتیٰ کہ مولانا فراہی و مولانا اصلاحی، جن کے نزدیک نظم قرآن کی اصولی حیثیت میں کوئی اختلاف نہیں اور جو اس سلسلہ میں استاد اور شاگرد کی نسبت بھی رکھتے ہیں، ان کے ہاں بھی بہت سے تفسیری اختلافات موجود ہیں۔ اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ نظم قرآن کی تلاش خالص عقلی کام ہے اور اسی وجہ سے اس میں ظن و شبہ کو بھی قوی دخل حاصل ہے۔

نتیجہ بحث

متعلقہ موضوع پر کی گئی بحث کا خلاصہ درج ذیل نکات کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱ ۔جس طرح بعض متقدم مفسرین نے نظمِ قرآن کو تفسیری فوائد و نکات کی حیثیت سے اپنی تفاسیر میں موضوعِ بحث بنایا ہے، اسی طرح آج بھی اسے وہی حیثیت دی جائے اور فوائد و نکات سے بڑھا کر اصول و مبادی کی حیثیت نہ دی جائے۔

۲ ۔نظم و مناسبت کے سلسلہ میں نکات و لطائف بیان کرتے ہوئے بے جا کھینچا تانی اور تکلفِ محض سے کام نہ لیا جائے۔

۳ ۔تعقل و تفکر سے حاصل ہونے والے ان لطائف و نکات کو حتمی قرار دے کر ان پر اصرار نہ کیا جائے، کیونکہ اس میں کئی نقصانات ہیں مثلاً:

(الف)اس سے قرآن مجید کے لطائف و عجائب محدود ہو جائیں گے، حالانکہ وہ لا محدود ہیں۔

(ب)اس سے فرقہ بندی کو مہمیز ہو گی، کیونکہ ایک فرقے کے نزدیک نظمِ کلام کے جو لطائف مقبول ہوں گے وہ انہی پر قائم ہو جائے گا اور ان لطائف کے منافی دیگر تمام لطائف کو رد کرے گا۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ اختلاف و انتشار اور گروہ بندی کی صورت میں برآمد ہو گا۔

(ج)جب رازی اور زمخشری جیسے ذہین دماغوں کے پیش کردہ لطائف و عجائب کو امت کی بڑی تعداد آج فضول و لایعنی مباحث سے تعبیر کرتی ہے، تو کچھ عجب نہیں کہ آج کے پیش کردہ مقبولِ عام لطائف کی بھی مستقبل میں یہی صورت حال ہو۔

۴ - تفسیری روایات کی جانچ پڑتال خالص محدثانہ اصولوں پر کی جائے اور کسی روایت کو محض اس بنیاد پر رد نہ کیا جائے کہ یہ ہمارے قائم کردہ نظم کے مطابق نہیں۔ اگر کسی صحیح حدیث سے کسی آیت یا سورت کا نظم درہم برہم ہوتا ہے تو اس کا معنٰی یہ ہے کہ اس نظم کا از سر نو بار بار جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

۵ - نظمِ قرآن سے متعارض کسی روایت کو خلافِ قرآن قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ قرآن کلام اللہ ہے، جب کہ نظمِ قرآن انسان کی اخذ کردہ ایک ایسی رائے ہے جس میں غلطی کا بھی اتنا ہی امکان ہے جتنا صحت کا۔